حصّہ دوم

تفسیر القرآن

سر سید احمد خان

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠١﴾	اور تم میں ایک گروہ ہونا چاہئے کہ بلاوے (لوگوں کو) نیکی کی طرف اور اور اچھے کام کرنے کو کہے اور بُرے کاموں سے منع کرے اور وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے ﴿١٠٠﴾ اور اُن لوگوں کی مانند مت ہو جنہوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ اُن کے پاس نشانیاں آئیں اور وہی لوگ ہیں کہ اُن کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿١٠١﴾

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه مالهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا بل رفعه الله اليه (سورۂ نساء آیت ۱۵۶)	یہ قول نقل کیا ہے کہ ”یہودی کہتے تھے ہم نے عیسٰے بن مریم رسول خدا کو قتل کر ڈالا حالانکہ نہ انہوں نے اُن کو قتل کیا اور نہ صلیب پر مارا ولیکن اُن پر (صلیب پر مار ڈالنے کی) شبیہ کر دی گئی اور جو لوگ کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں البتہ وہ اس بات میں شک میں پڑے ہیں اُن کو اُس کا یقین نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کے انہوں نے اُن کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اپنے پاس اُن کو اُٹھا لیا +

پہلی تین آیتوں سے حضرت عیسٰے کا اپنی موت سے وفات پانا علانیہ ظاہر ہے مگر چونکہ علمائے اسلام نے بتقلید بعض فرق نصاریٰ کے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسٰے زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں، اس لئے انہوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کو بیجا کوشش کی ہے +

پہلی آیت میں صاف لفظ ”متوفيك“ کا واقع ہے جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لئے جاتے ہیں، خود قرآن مجید سے اس کی تفسیر پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”الله يتوفى الانفس حين موتها“ ابن عباس اور محمد ابن اسحٰق نے بھی جیسے کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ”متوفيك“ کے معنی ”مميتك“ کے لئے ہیں +

یہی حال لفظ ”توفيتني“ کا ہے جو دوسری آیت میں ہے اور جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی یعنی جب میں مر گیا اور اُن میں نہیں رہا تو تو اُن کا نگہبان تھا +

پہلی آیت میں اور چوتھی آیت میں لفظ ”رفع“ کا بھی آیا ہے جس سے حضرت عیسٰے

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۱۰۲﴾	جس دن کچھ منہ سفید ہونگے اور کچھ منہ کالے ہونگے پھر جن کے منہ کالے ہونگے (اُن سے کہا جاویگا) کہ کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے پھر عذاب (کا مزہ) چکھو اپنے کافر ہونے پر ﴿۱۰۲﴾

کی قدر و منزلت کا اظہار مقصود ہے نہ یہ کہ اُن کے جسم کو اُٹھا لینے کا۔ تفسیر کبیر میں بھی بعض علما کا قول لکھا ہے کہ لفظ "رفع" کا تعظیما اور تفخیما بولا گیا ہے ۞

جن علما نے "متوفیک" کے معنی "ممیتک" کے قرار دئے تھے انہوں نے قرآن مجید کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھے تھے، اُن کا خیال تھا کہ یہودیوں نے حضرت عیسےٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی موت سے مرے مگر انہوں نے "رافعک" کے معنوں میں غلطی کی جو یہ خیال کیا کہ پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے، کیونکہ "رافعک" کے لفظ سے جیسا ہم نے اوپر بیان کیا آسمان پر جانا لازم نہیں آتا۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسےٰ پر موت طبعی طاری کرنے سے مقصود یہ تھا کہ اُن کے دشمن اُن کو قتل نہ کر سکیں۔ وہب کا یہ قول ہے کہ وہ تین گھنٹے تک مردہ رہے اور محمد ابن اسحاق کا قول ہے کہ سات گھنٹے تک، پھر زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے، اور ربیع ابن انس کا قول ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آسمان پر اٹھاتے وقت موت دی ۞

متوفیک ای ممیتک وھو مروی عن ابن عباس ومحمد ابن اسحاق قالوا والمقصود ان لا یصل اعداؤہ من الیھود الی قتلہ ثم انہ بعد ذلک اکرمہ بان رفعہ الی السماء ثم اختلفوا علی ثلاثۃ اوجہ احدھا قال وھب توفی ثلاث ساعات ثم رفع وثانیھا قال محمد ابن اسحاق توفی سبع ساعات ثم احیاہ اللہ ورفعہ الثالث قال الربیع بن انس انہ تعالی توفاہ حین رفعہ الی السماء قال تعالی اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا

(تفسیر کبیر)

بہرحال ان اقوال سے اس قدر ثابت ہوا کہ بعض علما اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حضرت عیسےٰ کو موت طبعی طاری ہوئی، اور بعض علما نے رفع کے لفظ سے حضرت عیسےٰ کے جسم کا آسمان پر اٹھا لینا مراد نہیں لیا، بلکہ اُس سے اُن کی قدر و منزلت مراد لی ہے پس جب ان دونوں قولوں کو تسلیم کیا جاوے تو جو ہم بیان کرتے ہیں وہی پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کو یہودیوں نے نہ سنگسار کر کے قتل کیا نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے

لہ قولہ رافعک الی ان المراد الی محل کرامتی وجعل ذلک رفعا الیہ للتفخیم والتعظیم ومثلہ قولہ انی ذاھب الی ربی وانما ذھب ابراھیم صلعم من العراق الی الشام وقد یقول السلطان ارفعوا ھذا الامر الی القاضی وقد یسمی الحجاج زوار اللہ ویسمی المجاورون جیران اللہ والمراد من کل ذلک التفخیم والتعظیم فکذلک ھھنا ۞

سر سید احمد خان

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۰۳) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۴)	اور جن کے منہ سفید ہونگے تو اللہ کی رحمت میں ہونگے وہ اس میں ہمیشہ رہینگے (۱۰۳) یہ ہیں نشانیاں اللہ کی ہم تجھ کو پڑھ سناتے ہیں برحق، اور اللہ لوگوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا (۱۰۴)

اور خدا نے اُن کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا ✤

ان آیتوں میں ایک لفظ بھی غور کے قابل ہے یعنی "مادمت فیہم" اس کے صاف معنی ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا، اور اُس کی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے جہاں فرمایا ہے "مادمت حیا" پس صاف ظاہر ہے کہ جو معنی "حیا" کے ہیں وہی معنی "فیہم" کے ہیں، اس کے بعد ہے "فلما توفیتنی" تو اس سے اور بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے حیا ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ جب تک میں اُن میں تھا یعنی زندہ تھا تو میں اُس پر شاہد تھا، اور جب تو نے مجھے موت دی تو تو اُن کا نگہبان رہا۔ پس ان دونوں آیتوں میں اس دنیا ہی میں حضرت عیسیٰے کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے ✤

اب باقی رہی چوتھی آیت، مگر جب یہ تحقیق ہو گیا کہ یہودی یہ دعوے کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰے کو سنگسار کر کے قتل کیا تھا۔ اور عیسائی یقین کرتے تھے کہ یہودیوں نے صلیب پر حضرت عیسیٰے کو قتل کیا تھا، حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں، وہ سنگسار تو ہرگز نہیں ہوئے، صلیب پر البتہ لٹکائے گئے مگر صلیب پر مرے نہیں۔ ان دونوں اعتقادوں کے رد کرنے کو خدا نے فرمایا کہ "ماقتلوہ وماصلبوہ" پہلے "ما" نافیہ سے نفس قتل کا سلب ہوتا ہے اور دوسرے سے کمال صلیب کا۔ کیونکہ صلیب پر چڑھانے کی تکمیل اُسی وقت تھی جب صلیب کے سبب موت واقع ہوتی، حالانکہ صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی "ولکن شبہ لھم" سے اور زیادہ تشریح اس مطلب کی ہوتی ہے۔ تشبیہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں، ایک مشبہ، ایک مشبہ بہ۔ ایک وجہ تشبیہ۔ ایک مشبہ لہ، اس آیت میں صرف دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مشبہ جو حضرت عیسیٰے علیہ السلام تھے۔ دوسری مشبہ لہم جو یہودی تھے اور جو درپے قتل حضرت مسیح تھے مشبہ بہ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے جب بعض عیسائی فرقوں کا قول پایا کہ شمعون یا یہودا صلیب پر چڑھایا گیا تھا اُنھوں نے جھٹ قرآن کے معنی بدل دیئے، اور یہودا یا شمعون کو مشبہ اور حضرت عیسیٰے کو مشبہ بہ، اور یہودا یا شمعون کی تبدیل صورت کو

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کام رجوع کئے جاتے ہیں ﴿۱۰۹﴾ تم اچھی امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے اچھے کاموں کے کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں کے کرنے سے منع کرتے ہو اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آویں تو بلاشبہ اُن کے لئے اچھا ہے اُن میں سے بعضے ایمان والے ہیں اور اکثر اُن میں فاسق ہیں ﴿۱۱۰﴾

وجہ تشبیہ قرار دیدیا۔ حالانکہ یہاں صرف مشبہ بہ محذوف ہے اور وہ "موتی" ہے، اور وجہ تشبیہ وہ حالت ہے جو حضرت عیسےٰ پر طاری ہوئی تھی جس کے سبب وہ مردہ تصور ہوئے تھے۔ پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ "وما صلبوہ ولکن شبہ لھم بالموتی" ۔ اس کی زیادہ تصریح اسی آیت کے اگلے لفظوں سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں اُن کو کچھ علم نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کے" اور پھر اس کے بعد تاکیداً اور یقیناً فرمایا کہ "اُنہوں نے عیسےٰ کو قتل نہیں کیا"، اور اس تمام پر صلیب کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قتل کی نفی کی، اور اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اوپر جو صلیب کی نفی کی تھی اُس سے نفی قتل بالصلیب مراد تھی نہ مطلق صلیب کی۔ ثم اماتہ اللہ باجل مسمی ورفعہ الیہ کما قال اللہ تعالیٰ بل رفعہ اللہ الیہ ✦

انہی باتوں پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عیسائی عالموں سے مباہلہ چاہا جس سے ایک نہایت عمدہ طور پر فطرت انسانی ظاہر ہوتی ہے۔ تمام اہل مذاہب خواہ صحیح مذہب رکھتے ہوں یا غلط دو قسم کے ہوتے ہیں جہلا اور علما۔ جہلا کا یقین مذہبی باتوں پر نہایت پختہ اور مستحکم ہوتا ہے، اور جو کچھ اُنہوں نے سمجھا ہے یا سیکھا ہے اُس کے سوا وہ اور کچھ نہیں جانتے، اور کوئی شبہ اُن کے دل میں نہیں ہوتا۔ اُن کی مثال اندھے آدمی کیسی ہے کہ وہ اُس رستہ پر جو اُس کو کسی نے بتلا دیا ہے چلا جاتا ہے اور اُس کے ٹھیک ہونے پر یقین رکھتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ درحقیقت یہ رستہ اُسی جگہ جاتا ہے جہاں اُس کو جانا ہے یا نہیں۔ پھر اگر کسی نے کہدیا کہ میاں اندھے آگے گڑھا ہے یا دیوار ہے تو وہ بغیر کسی شک کے اُس پر یقین کر لیتا ہے اور ٹھیر جاتا ہے، پھر جس نے جو راہ بتائی اُس طرف ہو لیا۔ یہی جہلائے اہل مذہب کا حال ہے

سر سید احمد خان